جدیدیت کیا ہے

جدیدیت کے موضوع پر بات کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ ہمارے ادب میں جدیدیت کب شروع ہوئی اور کن کن منزلوں سے گزر کر آج کہاں تک پہنچی ہے۔ لیکن اس طور پر بات کرنے کو میرا جی یوں نہیں چاہتا کہ شاید اس طرح جدیدیت کی سن وار تاریخ تو مرتب ہو جائے لیکن اس سے نہ جدیدیت کا مفہوم واضح ہو گا اور نہ اس کے معنی سمجھ میں آئیں گے۔ اس کام کو ہم سرِ دست اہلِ علم اور اگلے وقتوں کے ان محققوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں جو اپنے دور کی تخلیقات کو محض اس لیے نہیں پڑھتے کہ وہ پُرانی نہیں ہیں اور جو ہر کرم خوردہ کتاب کو سینے سے اس طرح لگائے پھرتے ہیں گویا یہی حدیث و قرآن ہے۔ ان کے ہاں تاریخی شعور، طرزِ احساس، نظامِ خیال اور تہذیبی رویے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

میرا ارادہ تجریدی مصوری پر بھی اظہارِ خیال کرنے کا اس لیے نہیں ہے کہ میں ایسی جدیدیت سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں نہ یہاں میں کسی ایسی جدیدیت کو قابلِ ذکر سمجھتا ہوں جسے انسان اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے اوپر سے اوڑھ لیتا ہے۔ پھر میں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ میں محض تلخی، جھلاہٹ، اُداسی اور اکیلے پن کے اظہار کو بھی جدیدیت نہیں سمجھتا۔ اس کا مزہ تو پوری صداقت اور ذمہ داری کے ساتھ ہمیں امامِ جدیدیت حضرت بودلیر کی شاعری میں آجاتا ہے جو پُرمغز بھی ہے اور بامعنی بھی جس میں

صنعتی تہذیب کی روح چہک چہک کر بول رہی ہے۔

اب ایسے میں جدیدیت سے جب میں یہ ساری چیزیں خارج کر دیتا ہوں تو لازمی طور پر آپ کے اندر یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہوگی کہ میں جدیدیت کی کوئی ایسی تعریف کر دوں کہ دو لفظوں یا زیادہ سے زیادہ دو جملوں میں آپ کی سمجھ میں اس کے معنی اور مفہوم آجائیں۔ لیکن میرے ساتھ مشکل یہ آپڑی ہے کہ "جدیدیت" کے ایسے معنی مجھے خود بھی معلوم نہیں اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جو چیز مجھے معلوم نہ ہو اس کی تشریح میں کیسے اور کیوں کر کر سکتا ہوں؟ اس لیے میرا ارادہ یہ ہے اور یہی مناسب ہے کہ میں خود "جدیدیت"، کو سمجھنے کی کوشش کروں۔

جدیدیت کے سلسلہ میں ایک بات تو میرے ذہن میں یقینی طور پر یہ آتی ہے کہ "جدیدیت" ایک اضافی چیز ہے، وہ چیز جس کا تعلق کسی لمحہ کسی خاص زمانے یا دور سے ہو گا وہ اضافی ہوگی مطلق نہیں۔ اس اعتبار سے جدیدیت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جاسکتی جو دس سال بعد بھی صحیح و درست ہو۔ آج کی جدیدیت کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔ ان ہی معنی میں ہر جدید میں قدیم شریک رہتا ہے۔ روایت کے بھی یہی معنی ہیں۔ اب ذرا آگے چلیں۔ ہر نسل، اور یہ کوئی اختلافی بات نہیں ہے، اپنی ذہنی و مادی ضرورتوں اور عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے معیار اور اپنے پیمانے خود مقرر کرتی ہے اور ان ہی پیمانوں سے اپنے دور کو، اپنے ماضی کو اور اپنے ادب پاروں کو ناپتی ہے۔ ماضی اور اس کے وہ ادب پارے جن میں اسے اپنے طرز احساس، انداز فکر کا شعور اور عکس نظر آتا ہے وہ اپنے سینے سے لگا کر اپنے معیاروں کے پیش نظر انہیں نئے معنی دے دیتی ہے اور باقی کو رد کر دیتی ہے۔ فکری سطح پر دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ان معنی میں ہم ہر نسل کے ایسے معیاروں اور پیمانوں کو، جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھتی اور ناپتی ہے،

ہم جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں۔ ان معیاروں میں نظامِ خیال بھی جس پر معاشرہ کا ڈھانچہ اور روح قائم ہے، شامل ہے اور اس نسل کے رویّے، اندازِ فکر اور طرزِ احساس بھی۔ بات ذرا مشکل ہو گئی ہے۔ آیئے اسے مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک زمانے میں "جدیدیت" سرسید تحریک کا نام تھا۔ گویا وہ اندازِ نظر اور وہ رویّہ جس سے سرسید نے اس قوم کے حال اور ماضی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور جس کی مدد سے اس قوم کا احیاء ممکن ہو سکا۔ ۱۹۲۰ء کے قریب ٹیگوریت اور رومانی تحریک جدیدیت کے مترادف تھی۔ ۱۹۳۶ء میں "جدیدیت" ترقی پسندی کا نام تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد اجتماعی شعور کا اظہار نئی غزل کے روپ میں جدیدیت کہلاتا تھا لیکن آج ۱۹۶۸ء میں ہم ان میں سے کسی کو بھی "جدیدیت" کہہ سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "جدیدیت" ایک اضافی چیز ہے جس کے معنی ہر نسل کے ساتھ ہر دور میں بدل جاتے ہیں اور اسے زمانۂ مستقبل میں پھیلانا ایک بے معنی بات ہے۔

میں یہاں تک پہنچا تو ایک سوال نے پھر پریشان کرنا شروع کیا۔ یہ جدیدیت جو اضافی ہے اور جو ہر نسل کے ساتھ بدلتی رہتی ہے آخر ہمارے ہاں کہاں سے آ گئی؟ ولی دکنی سے داغ دہلوی تک یا حافظ شیرازی سے عرفی، نظیری، بلکہ غالب تک۔ جدیدیت کا سوال کبھی نہیں اٹھا بلکہ جب جب ہم نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو ان کے انفرادی مزاج کی بات تو کی اور یہ کہا کہ ان کی شاعری انسان کے ہمیشہ تازہ رہنے والے بنیادی جذبوں اور محسوسات کا اظہار کرتی ہے لیکن جدیدیت کی تلاش کبھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ انگریزوں کے تسلط کے فوراً بعد سرسید کے ساتھ ہمارے معاشرہ میں پیدا ہوا اور اس کے پیدا ہونے کا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ جب ایک طرف مغرب کے خیالات اور ان کا صنعتی نظام آیا تو اس زرعی نظام والے جامد معاشرہ میں

تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا۔ انگریزوں کے تسلط و اقتدار سے پہلے ہمارا معاشرہ خالصتاً زرعی معاشرہ تھا۔ غیر متحرک، جامد اور غیر مبتدل۔ برسوں سے، صدیوں سے ایک ڈگر پر چلنے والا۔ جہاں تبدیلی بدعت اور کفر تھی۔ اس کے برخلاف صنعتی معاشرہ متحرک، نامیاتی اور اور ہر دم بدلنے کی طرف مائل۔ "جدیدیت" کا مسئلہ بھی اس متحرک نظام کی پیداوار ہے۔ اس بات کو یوں کہہ لیجئے کہ صنعتی نظام میں نت نئی ایجادات اور انکشافات سیاست اور نظام معیشت کو ہر دم متاثر اور تبدیل کرتے رہتے ہیں اور ان تبدیلیوں کا اثر معاشرہ اور فرد کی فکر اور اس کے اندازِ نظر پر بھی پڑتا ہے۔ فکر اور اندازِ نظر کی تبدیلیوں کے ساتھ انسانی ضرورتیں اور تقاضے بھی بدلتے ہیں۔ پرانی چیز بھی اسی نسبت سے از کار رفتہ ہو جاتی ہے اور ہر نسل کو پھر سے اپنی اقدار اپنے نظام خیال، اپنے نظام معیشت و سیاست کا جائزہ لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جدیدیت صنعتی معاشرے کے ہر دم بدلنے والے مزاج کا منطقی نتیجہ ہے۔ جیسے جیسے صنعتی نظام ہمارے معاشرے میں سرایت کرتا جا رہا ہے ویسے ویسے تبدیلیوں کی اکھاڑ پچھاڑ بھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور "جدیدیت" کا مسئلہ ہر نسل کے لیے اہم سے اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہاں پہنچ کر آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ "جدیدیت" انسانی ضرورت ہے لیکن ہوائی عمل ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص نظام خیال کی قبولیت سے پیدا ہوا ہے جس کا اثر و نفوذ مسلسل بڑھتا رہے گا۔ میرے خیال میں یہاں یہ بات مجھے یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ صنعتی نظام مغرب کا نظام ہے اور ہمارے معاشرے میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، آ رہی ہیں، یا مستقبل قریب میں آئیں گی وہ مغرب کے زیر اثر ہی آئیں گی۔ اسی لیے مولانا حالی نے ہماری دکھتی رگ پکڑ کر جدیدیت کا سب سے پہلا مینی فیسٹو ان الفاظ میں لکھا تھا ؎ حالی اب آؤ پیروی مغرب کریں۔

اب دیکھئے سرسید اور حالی کے دور سے لے کر آج تک نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں بلکہ تمام ترقی پذیر ملکوں میں ایک نہ ایک شکل میں پیروئ مغربی کا یہی

جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور ہمارا، خواہ ہم اسے مانیں یا نہ مانیں، لائحۂ عمل اور مقصدِ منزل یہی مینی فیسٹو ہے ع

حالیؔ اب آؤ پیروئ مغربی کریں۔

مولانا حالیؔ خدا انہیں جنت نصیب کرے، ہمارے دانشوروں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اب آپ قدم قدم چلیئے۔ دھوپ بھی دیواروں سے آہستہ آہستہ اتر کر کھیت، کھلیانوں اور میدانوں میں پہنچ گئی ہے۔ اب جو کچھ ہونا ہے آئیے اسے کھلے دل سے قبول کرلیں! اس بات پر میں پھر ایک بار زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ہماری فکر اور اندازِ نظر میں، ہمارے نظامِ خیال اور طرزِ احساس میں، ہمارے علوم و فنون میں، ہمارے عقائد اور اخلاق میں، ہمارے قوانین اور رسم و رواج میں، ہمارے اطوار و عادات میں جو کچھ تبدیلیاں آرہی ہیں ان میں صنعتی نظام کی چھاپ لگی ہے اور یہ نظام مغرب کا نظام ہے۔ ادب میں جب بھی کوئی جدیدیت کی آواز اٹھاتا ہے مغرب ہی سے رجوع کرتا ہے۔ وہ خواہ سرسید، حالیؔ، اقبالؔ ہوں یا آسکر وائلڈ سے استفادہ کرنے والے نیاز فتح پوری، بودلیئر، ملارمے اور ایڈگرایلن پو سے استفادہ کرنے والے میراجی، راشد ہوں یا سمرسٹ مام، ڈی ایچ لارنس اور موپاساں سے گر سیکھنے والے منٹو ہوں وہ مسلمان عسکری ہوں یا ہندو فراقؔ سب جدیدیت کا درس مغرب سے لیتے ہیں۔ اس لیے اب جدیدیت کے مفہوم میں جب پیروئ مغربی شامل ہوگئی تو ساتھ ساتھ اس بات کو یہ کہہ کر صاف کر لیجیے کہ مغرب کے نظامِ خیال کی بنیاد سائنس اور سائنسی اندازِ فکر پر قائم ہے اس لیے سائنسی اندازِ فکر کو اپنے شعور اور طرزِ احساس کا حصہ بنا کر ہی ہم جدیدیت کی تلاش کر سکتے ہیں اور اسی وقت ہم جدیدیت سے صحیح معنی میں سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ تخلیقی کام لے سکتے ہیں۔ جدیدیت ان معنی میں ایک رویّے ایک اندازِ فکر کا نام ہے اور یہ رویّہ، یہ اندازِ نظر خلا میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق ہمارے ماضی سے بھی اتنا ہی ہوگا

جتنا خود اپنے دور سے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ زندہ اور "تخلیقی جدیدیت" سائنسی انداز نظر کی ہم راہی میں تاریخی شعور کی کوکھ سے پیدا ہوگی اور "تاریخی شعور" کے الفاظ میں ان ہی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جن معنی میں جناب ایلیٹ نے استعمال کیے ہیں۔ اس جدیدیت میں جب تاریخی شعور شامل ہوگا تو روایت کی کھنک دار آواز اس میں رس گھولے گی۔ اس کا لہجہ اس میں وقار اور اعتماد پیدا کرے گا۔ "زندہ جدیدیت" کے علم بردار ادیبوں کے لیے ضروری ہے اور یہ بات ہمیں ایلیٹ نے سکھائی ہے کہ لکھتے اور سوچتے وقت جہاں انھیں اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ سب رس، کربل کتھا، طلسم ہوش رُبا، چہار درویش، خطوط غالب، مقدمہ شعر و شاعری، سرسید کی تحریریں اور ولی سے لے کر آج تک کی ساری شاعری نہ صرف ایک ساتھ زندہ ہے بلکہ ایک ایسے نظام میں مربوط ہے جو ہمارے شعور کا آج بھی زندہ حصّہ ہے۔ جدیدیت سے اس تاریخی شعور کو خارج کر کے ادیب کے پاس نام نہاد چونکانے والا نیا پن رہ جائے تو رہ جائے اور آپ تکلف سے اسے جدیدیت کا نام بھی چاہیں تو دے دیجیے لیکن وہ ایسی تخلیق ہرگز نہیں کر سکتا جو پیدائش کے بعد کچھ دن زندہ رہ کر معاشرے کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ ایسے میں جو بھی تخلیق ہوگی اس میں جدیدیت اس مسخرے کے عمل سے مماثل ہوگی جو موت کے کنویں کے باہر ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس مچان پر کھڑا لمبی سی ٹوپی لگائے، مرد ہو کر زنانے کپڑے پہنے مٹک مٹک کر اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جناب ایلیٹ نے جب یہ بات سنی تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ "نئی نسلوں کو ایک بار پھر یہ بتا دو کہ کوئی شاعر، کوئی فن کار تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت تو اس میں مضمر ہے کہ مرحوم شعرا اور فن کاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اصل فن کار وہ ہے جس کا تاریخی شعور زندہ ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے اسی طرح حال ماضی کو بدلتا رہتا ہے۔" میں اس بات کی اقبال کے حوالے سے ذرا سی وضاحت کر دوں۔ اقبال کا

تاریخی شعور زندہ تھا۔ اس نے مرحوم شعراء سے اپنا رشتہ دریافت کر لیا تھا۔ اس نے ماضی سے حال کا رشتہ متعین کر کے پھر خود حال سے ماضی کو بدل دیا۔ اسلام کے قدیم تصور میں تاریخی شعور کے ساتھ روایت کا دامن تھامے جدیدیت کے وہ تمام عناصر شامل کر دیئے جو آفاقی بھی ہیں، ہماری روایت سے وابستہ بھی اور عہد حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق بھی۔ یہ جدیدیت کے مثبت معنی کی مثال ہے۔ جدیدیت کے منفی معنی کی شاعری کی مثال سے اس وقت اردو ادب کے رسائل بھرے پڑے ہیں جیسے آپ سہولت کے لیے ایک ٹانگ کی یا بغیر ٹانگوں کی تصویر کہہ لیجئے یا پھر اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ایک ایسے بدھے کو ذہن میں رکھیئے جس کے بنیادی ہی نہ ہو بغیر بنیاد کے آخر کون سی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے: یہ کہہ کر میں جس چیز کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری تمام جدید اقدار: جدید انداز نظر، نظام خیال، ادارے، رسوم و رواج، جدید فن تعمیر، جدید لباس، مسلم حقائق اور اصول جنہیں ہم مانتے اور تسلیم کرتے ہیں سب کے سب خلا میں پیدا نہیں ہوئے اور یہ سب کے سب صرف محض جدید دور کی پیداوار بھی نہیں ہیں۔ ان میں ہماری روایت کی روح تحلیل ہو کر نئے معنی پیدا کر رہی ہے۔ اس لیے اگر جدیدیت کے معنی ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہر نقش کہن کو مٹا دیا جائے، ہر روایت کو جلا دیا جائے تو ہم تخلیقی و فکری سطح پر صرف ہوا میں گرہ لگانے کی کوشش کریں گے جس کا نتیجہ وہی اکیلا پن، وہی تلخی، وہی اداسی وہی ذہنی پسپائیت اور وہی فرار ہو گا جس سے آج ہمارے ادب کی "جدیدیت" دوچار ہے۔

لیکن صاحبو! آپ مجھ سے اب یہ پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ بحرانی اور ہوائی عمل ہمارے یہاں کیوں ہو رہا ہے؟ ہماری آج کی جدیدیت اتنی پھس پھسی اور بھونڈی کیوں ہے ـــــ اس کا جواب گو آسان نہیں ہے لیکن فکری سطح پر جب میں اپنے کلچر، اپنی تاریخ، اپنے معاشرے اور اپنے ادب کو ایک اکائی، ایک وحدت

کے طور پر دیکھتا ہوں تو مجھے چند مسائل، چند باتیں دُور خیالات کے جنگل میں سر اُٹھائے نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ہماری جدیدیت ہمارے کلچر کے زوال کی علامت ہے اور کسی کلچر کا زوال قدرتی طور پر اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل و انتشار اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا نظامِ خیال جاں کنی کی حالت میں سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ پرانے تہذیبی سانچے اور طرزِ احساس اپنے معنی کھو رہے ہیں۔ معاشرے کی خواہشات اور تہذیبی اقدار ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ اندر ہی اندر ایک بے جہت انقلاب ہمیں بدحال کر رہا ہے۔ سارے تہذیبی رشتے بکھر رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کا ربط ٹوٹ گیا ہے۔ سر اور دھڑ الگ الگ ہو گئے ہیں۔ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے کہ زندہ نظامِ خیال کی قوت سے اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ اگر معاشرے کے پاس اقدار و خیال کا صحت مند نظام باقی نہیں رہا ہے اور معاشرہ خود کو بدلنے کے کرب میں مبتلا ہے تو اس معاشرہ کی ہر تخلیقی سرگرمی اور ادب بھی مردہ اور بے جان ہو گا۔ ادب خلا میں، تہذیبی تعطل میں منجمد نظامِ خیال کے بوسیدہ دائرہ میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی قوت کے شدید ضعف کے باعث آج ہمارا ادب معاشرے کے لیے ایک روحانی تجربہ نہیں رہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ ادب اور ہر تخلیقی سرگرمی کا تعلق براہِ راست نظامِ خیال سے ہوتا ہے۔ ہر نظامِ خیال اندرونی طور پر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جس کی اپنی مخصوص روح، مخصوص شخصیت اور مزاج ہوتا ہے۔ یہ روح اپنا اظہار اپنے علوم و فنون، اپنے فلسفے، اپنے اداروں اور اپنی متنوع تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعہ کرتی ہے۔ ہر تخلیقی سرگرمی ایک زندہ نظامِ خیال کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور نظامِ خیال کے انجماد کے ساتھ اپنے سارے تہذیبی اداروں اور اظہار کے سانچوں کے ساتھ خود منجمد ہو جاتی ہے۔ ہمارے تہذیبی تعطل اور بے معنویت کی

وجہ یہ ہے کہ ہمارا کلچر اور اس کے تہذیبی سانچے مغرب کے کلچر کے ہاتھوں اپنی مکمل فنا پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔ ایک طرف مغرب کا کلچر سائنسی ترقی کے ساتھ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو ہمارے اپنے نظامِ خیال کے تہذیبی دائرے سے باہر کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف اس دائرے کی مرکزی کشش اسے اپنے اندر کی طرف کھینچ رہی ہے اسی لیے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ معطّل کھڑا ہے اور سارا سماج انتشار، تضاد، کش مکش، تصادم، بےیقینی اور عدمِ توازن کا شکار ہے۔

اور صاحبو! چوتھی بات یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے آج سے سو سال پہلے مغرب اور عربی عجمی ہندی کلچر کے جن دو دھروں کو ملا کر ایک دائرہ بنانا چاہا تھا آزادی کے بعد وہ دائرہ مکمل ہو گیا ہے۔ سر سید سے لے کر اب تک ہم مغرب کو ڈرے ڈرے انجان سے بن کر قبول کر رہے ہیں لیکن اب یہ بات بھی سامنے آ چکی ہے کہ اس عمل نے اوپر کے طبقے کو بالخصوص اور متوسط طبقے کو بالعموم نقّال اور بہروپیا بنا کر اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ نچلا طبقہ اس کھوکھلے ڈھانچے کے بہروپ کو حیرت، اشتیاق اور ندیدہ پن سے تک رہا ہے۔ اب ہمیں ایک نئے دائرے کی ضرورت ہے۔ تاریخ کی نئی تعبیر اور نئے تاریخی شعور کے ذریعہ ہم ایک ایسے دائرے کی تشکیل کر سکتے ہیں جس کا سنگم مغرب اور ہمارے اپنے کلچر کے گہرے اور وسیع ادراک پر قائم ہو یہی سنگم ہمارا "ابعادِ رابع" (EOURTH DIMENSION) ہے۔

اور یہ میرا ایمان ہے کہ اسی فکر کی کوکھ سے جدیدیت کا نیا سورج طلوع ہو گا جس کی روشنی سے انتشار کی ظلمتیں، تضاد اور بےیقینی کے اندھیرے، بحران و بےمعنویت کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور تخلیقی سطح پر ہماری نسل آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی ورثہ چھوڑ کر تاریخ کی جھولی میں جا گرے گی۔

(۱۹۶۸ء)